OPEN ACCESS

KJMR

Kashf Journal of Multidisciplinary Research
Vol: 03 - Issue 03 (2026)
P-ISSN: 3007-1992 E-ISSN: 3007-200X
https://kjmr.com.pk

سلام بن رزاق کے ہاں اسطورہ بطور سماجی استعارہ

MYTH AS A SOCIAL METAPHOR IN THE FICTION OF SALAM BIN RAZAQ

Sukaina Bashir
Scholar Ph.D. Urdu. Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

Dr. Aqlima Naz*
Assistant Professor. Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

Corresponding Author: aqlimanaz@fjwu.edu.pk

DOI: https://doi.org/10.71146/kjmr864

Article Info

This article is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license https://creativecommons.org/licenses/by/4.0

Abstract

Salam bin Razzaq is one of the finest creative writers in Urdu literature, who has shaped tradition, symbolism, and myth into a meaningful social narrative through his fiction. He does not use myth merely as an aesthetic device; rather, he employs it as an intellectual tool to understand and express the social, political, and cultural crises of his time. In his short stories, mythical symbols such as gods, sacrifice, and darkness emerge as metaphors for power structures, oppressive systems, and the marginalized human condition, where individual suffering transforms into a representation of collective consciousness. In this way, Salam bin Razzaq, through a mythic language, not only makes the harsh realities of society comprehensible but also awakens critical awareness in the reader, thereby securing a unique and influential place in modern Urdu fiction.

Keywords:

Myth, Social Metaphor, Collective Unconscious, Symbolism, Modern Urdu Fiction, Salam bin Razzaq, Social Consciousness, Power Structures, Marginalized Humanity.

اسطورہ محض قدیم انسان کی فکری اختراع نہیں بلکہ انسانی تہذیب کا وہ بنیادی بیانیہ ہے جس کے ذریعے معاشرتی اقدار، اجتماعی خوف اور طاقت کے تصورات علامتی صورت میں محفوظ ہوتے رہے ہیں۔ جدید تنقید نے اسطورہ کو ایک ایسے علامتی نظام کے طور پر شناخت کیا ہے جو فرد کے لاشعور سے آگے بڑھ کر پورے سماج کے اجتماعی شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔ جب جدید افسانہ نگار اسطورہ کو اپنے متن میں برتتا ہے تو وہ دراصل موجودہ سماجی بحران کو ایک ماورائی اور تمثیلی زبان میں پیش کرتا ہے جس سے قاری کے ذہن میں معنی کی کئی سطحیں بیک وقت روشن ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اسطورہ صرف کہانی نہیں رہتا بلکہ سماجی شعور کی ایک متحرک اور علامتی صورت بن جاتا ہے۔

"Myth is a body of traditional stories that are a collective expression of the human psyche."(1)

سماجی شعور دراصل انسان کے اس اجتماعی ادراک کا نام ہے جس کے ذریعے وہ اپنے ماحول، جبر، ناہمواری اور تہذیبی تضادات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب اس شعور کو اسطورہ کی علامتی زبان ملتی ہے تو سماج کے پوشیدہ مسائل زیادہ گہرے اور دیرپا اثر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو افسانے میں اسطورہ محض ایک جمالیاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک فکری ہتھیار بن جاتا ہے جو سماجی ناانصافی، طاقت کے مراکز اور انسانی بے بسی کو تمثیلی انداز میں بے نقاب کرتا ہے۔

"Myth is a way of giving form to the formless fears and desires of society."(2)

جدید تنقیدی فکر میں اسطورہ کو ایک ایسے بیانیے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو تاریخ، تہذیب اور سماجی ساخت کے درمیان ایک علامتی پل قائم کرتا ہے۔ ادب میں اسطورہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسانی تجربے کو ایک ہمہ گیر فکری نظام میں ڈھال دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسطورہ سماجی شعور سے جڑتا ہے تو وہ محض ماضی کی کہانی نہیں رہتا بلکہ حال کے سماجی تضادات کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں اسطورہ جدید انسان کے وجودی کرب اور اجتماعی المیے کو ایک ہمہ گیر علامتی زبان میں منتقل کر دیتا ہے۔

یوں اسطورہ اور سماجی شعور کا رشتہ محض ادبی یا جمالیاتی نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری نوعیت کا ہے۔ اسطورہ سماج کے اجتماعی لاشعور میں موجود خوف، امید، جبر اور مزاحمت کو ایک ایسی علامتی صورت دیتا ہے جو ہر عہد میں نئے معنی پیدا کرتی ہے۔ جدید افسانہ نگار اسی اساطیری زبان کے ذریعے سماج کی تلخ حقیقتوں کو قابلِ فہم اور فکری طور پر بامعنی بنا دیتا ہے۔

"Myth is not a lie, but a symbolic truth that reveals the deepest structures of society."(3)

اسی فکری تناظر میں اگر ہم اردو افسانے کی روایت پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسطورہ نے محض ایک علامتی پیرایہ ہی فراہم نہیں کیا بلکہ ایک ایسا تہذیبی شعور بھی عطا کیا جس کے ذریعے افسانہ نگار اپنے عہد کے تضادات، بحرانوں اور سماجی جبر کو ایک ہمہ گیر معنیاتی نظام میں سمو سکتا ہے۔ ان ہی تضادات کو مغربی مفکر کلاڈ لیوی سٹراس نے بھی اپنی اساطیری تھیوری میں بطورِ خاص موضوع بنایا ہے اگرچہ انہوں نے اس تصور کو اردو ادب کی روایت سے ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے پیش کیا۔ اردو ادب کی قدیم کہانیوں اور افسانوی روایت میں اساطیر کو زیادہ تر دیومالائی دنیا یا مافوق الفطرت قصوں سے ماخوذ سمجھا جاتا رہا ہے جب کہ لیوی سٹراس نے اساطیر کو محض کہانی یا اساطیری کرداروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک باقاعدہ سماجی اور تہذیبی ساخت کے طور پر دیکھا۔

لیوی سٹراس نے اس حوالے سے متعدد مضامین تحریر کیے تاہم ان کی بنیادی اور نمائندہ تحریرThe Structural Study of Myth(1955)ہے جس میں انہوں نے اساطیر اور سماج کے باہمی رشتے کو واضح کیا۔اس تھیوری کے مطابق اسطورہ دراصل تہذیب، ثقافت، مذہب، رسوم ورواج، خیر وشر، فطرت و سماج، خوف اور جبر جیسے متضاد مگر باہم مربوط عناصر کا ایک علامتی نظام ہے، جو اجتماعی شعور کی سطح پر تشکیل پاتا ہے۔ لیوی سٹراس کے نزدیک اساطیر کا تعلق براہِ راست معاشرے سے ہے، کیونکہ یہی تمام عناصر سماجی زندگی میں کسی نہ کسی صورت موجود ہوتے ہیں اور اساطیری بیانیہ ان کو ایک منظم ساخت میں ڈھال دیتا ہے۔

جب کوئی مصنف تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر انہی تہذیبی، سماجی اور فکری عناصر کو اپنی تحریر کا حصہ بناتا ہے اگرچہ ان کی صورتیں اور اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جدید اردو افسانہ نگاروں نے اساطیری زبان کو محض تخلیقی تجربہ یا جمالیاتی صنعت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماج کی پوشیدہ ساخت کو سمجھنے اور اس پر سوال اٹھانے کا ایک مؤثر وسیلہ بنا دیا۔اسی روایت کے تسلسل میں سلام بن رزاق ایک ایسے فن کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے اسطورہ کو محض جمالیاتی عنصر نہیں بلکہ سماجی تنقید کے ایک طاقتور استعارے میں ڈھال دیا۔ چنانچہ لیوی سٹراس کے اساطیر کے حوالے سے پیش کردہ یہ فکری نکات سلام بن رزاق کے افسانوں میں بھی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں جہاں اسطورہ سماج کے دبے ہوئے تضادات اور جبر کے نظام کو علامتی سطح پر آشکار کرتا ہے۔

سلام بن رزاق کے تین اہم افسانوی مجموعے "معبر"، "زندگی افسانہ نہیں" اور "شکستہ بتوں کے درمیان" ہیں جو ان کے فکری وفنی ارتقا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان مجموعوں میں موجود افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ سلام بن رزاق کا ادبی مقام اس اعتبار سے منفرد ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحران کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے اساطیری اور علامتی پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فرد کی تنہائی، شناخت کا بحران، طبقاتی جبر اور طاقت کے غیر مرئی ڈھانچے اس طرح ابھرتے ہیں کہ قاری محض ایک کہانی نہیں بلکہ پورے سماجی نظام کی علامتی تصویر دیکھتا ہے۔ وہ اساطیر کے ذریعے حال کے المیوں کو ماضی کی تمثیلات سے جوڑتے ہیں، جس سے ان کا بیانیہ نہ صرف گہرا بلکہ ہمہ زمانی معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔

> "اساطیر کی تمثیلی تشریحات بھی کی جاتی رہی ہیں۔ان کے اندر کارفرما علامتی اور استعاراتی معنی کو بھی بحث کا موضوع بنایا جارہا ہے۔۔۔اس طور پر اساطیر کی علامتی معنویتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اب وہ محض ایسے مظاہر میں بدل گئے ہیں جو انسانی حقائق اور قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔"(4)

سلام بن رزاق کے افسانوں میں اسطورہ بطور سماجی استعارہ اس طرح کارفرما نظر آتا ہے کہ دیوتا، قربانی، اندھیرا جیسے اساطیری پیکر دراصل طاقت کے مراکز، محکوم انسان اور جبر کے نظام کی علامت بن جاتے ہیں۔ وہ اساطیری فضا کے ذریعے سماج کی وہ حقیقتیں نمایاں کرتے ہیں جو براہِ راست بیان میں محدود ہو جاتیں، یوں ان کے افسانوں میں اسطورہ ایک ایسی علامتی زبان میں ڈھل جاتا ہے جو قاری کو نہ صرف سماج کی پوشیدہ سچائیوں سے روشناس کراتا ہے بلکہ اس کے اندر مزاحمت اور فکری بیداری کی نئی سطحیں بھی پیدا کرتا ہے۔اسی تناظر میں سلام بن رزاق کے ہاں اساطیر بطور استعارہ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور یہ زیادہ تر خوف اور کشمکش کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے جنہیں مصنف نے اپنے افسانے "الٰکم" میں بنیادی کردار کے ذریعے یوں دِکھایا ہے:

"میں جب بھی اس اَلبم" میں اپنی تصویر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہوں میری تصویر پر کئی دوسرے چپک جاتے ہیں۔ یہ چہرے کوئی اور نہیں میرے ہی عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کے چہرے ہیں۔ جنم جنم کی معصومیت لیے، سفاک چہرے، جن کی خاموش چنگھاڑ سے میرے دماغ کی نسیں چٹخنے لگتی ہیں ۔ ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر ایک پیر گڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر ہوا اس قدر تیز ہے کہ ریزہ ریزہ بکھر جانے کا خوف برابر لگا رہتا ہے۔"(5)

درج بالا اقتباس میں خوف کو اسطورہ بطور استعارہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ کسی ایک شخص کا ذاتی ڈر نہیں رہتا بلکہ ایک اجتماعی سماجی خوف بن جاتا ہے۔ خاموش چنگھاڑنا اس اساطیری خوف کا استعارہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا مگر اندر ہی اندر انسان کو توڑ دیتا ہے جیسے دیومالائی قصوں میں کوئی غیر مرئی طاقت انسان کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح ریزہ ریزہ بکھر جانے کا خوف بھی اس بات کا استعارہ ہے کہ سماجی دباؤ اور داخلی کشمکش انسان کی شناخت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

اِسی خوف کی علامت کو بطور اسطورہ وہ افسانہ "بجوکا" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"آہ شام قریب آ رہی ہے۔ کسی ڈائن کی طرح دانت نکوستی، کتنا ڈر لگتا ہے اسے اب شام سے۔۔۔ کتنی بھیانک ہوتی ہیں یہاں کی شامیں۔۔۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ رات کا سناٹا اس کے کانوں میں چیختا رہتا ہے۔ چیختا رہتا ہے۔

شالو۔۔۔ شا۔۔۔۔۔۔۔ لو۔۔۔۔۔۔"(6)

نسوانی کردار کا یہ خوف استعاراتی صورت کو واضح کرتا ہے جس میں وقت، فضا اور یادیں ایک اساطیری پیکر اختیار کر لیتی ہیں۔ یہاں شام اور رات کسی معمول کے لمحے کے طور پر نہیں بلکہ ایک خوفناک وجود کی طرح سامنے آتی ہیں جو کردار کے اندر چھپے ہوئے اندیشوں، عدم تحفظ اور ماضی کے زخموں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ گھڑی کی آواز، خاموشی اور سناٹا سب مل کر ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو کردار کے ذہن پر مسلسل دباؤ ڈالتی ہے اور اس کے خوف کو شدت بخشتی ہے۔ اس طرح اسطورہ بطورِ استعارہ محض ایک تخیلاتی انداز نہیں رہتا بلکہ انسان کے لاشعور میں موجود ڈر اور تنہائی کی نمائندگی بن جاتا ہے۔ افسانہ "بجوکا" کا نسوانی کردار اسی علامتی فضا میں اپنے خوف کا سامنا کرتا ہے جہاں ماضی اور حال ایک دوسرے میں گھل کر ایک ایسا تجربہ بن جاتے ہیں جو قاری کو بھی اس کے اندرونی کرب اور بے چینی کا احساس دلا دیتا ہے۔

اس کی ایک مثال افسانہ "زنجیر ہلانے والا" سے ملاحظہ ہو:

"ایک گھڑ سوار ٹھیک ان کے گھر کے سامنے آ کر رک گیا ہے۔ پھر کوئی بھاری قدموں سے گھر کے سامنے والی پتھریلی سڑیاں چڑھنے لگا۔ ان سب کے چہرے سفید پڑ گئے۔ چندر بھان نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے گھر

والوں کی خوف زدہ آنکھوں نے اس کے حلق میں پھندا لگا دیا۔اس نے اپنی جگہ سے ہلنا چاہا مگر اسے لگا اس کی ٹانگیں کسی بگلے کی ٹانگوں کی طرح پتلی لاغر اور لمبی ہو گئی ہیں۔"(7)

سلام بن رزاق کے ہاں یہ منظر محض ایک خوفناک واقعہ نہیں بلکہ ایک گہرا سماجی استعارہ بن جاتا ہے۔گھڑ سوار کا اچانک آنا، بھاری قدموں کی آواز، اور گھر والوں کے سفید پڑتے چہرے دراصل کسی ان دیکھے جبر، طاقت اور خوف کی علامت ہیں جو سماج میں کمزور طبقے پر مسلط رہتا ہے۔یہ گھڑ سوار کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ اس نظام کی نمائندگی کرتا ہے جو طاقت، قانون یا رسم کے نام پر عام انسان کو خاموش کر دیتا ہے۔چندر بھان کا بول نہ پانا اور ٹانگوں کا بے جان ہو جانا اس اجتماعی بے بسی کی تصویر ہے جس میں مظلوم طبقہ نہ احتجاج کر سکتا ہے، نہ فرار۔یوں یہ منظر سماج میں رائج خوف، عدمِ تحفظ اور طاقت کے یک طرفہ نظام کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے جہاں انسان اپنی ہی زمین پر اجنبی اور بے اختیار ہو جاتا ہے۔مزید سلام بن رزاق اِسی خوفناک صورت حال کو افسانے کے اختتام میں یوں بیان کرتے ہیں جس سے آخر میں ایک سوال چھوڑ کر چلے جاتے ہیں:

"شاستروں میں لکھا ہے کہ زنجیر ہلانے والا۔۔۔

جملہ پھر ادھورا رہ گیا۔ٹاپوں کی زبردست دھمک نے ایک بار پھر اُس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔چندر بھان کی رگوں میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔اندھیرے میں چندر بھان نے دوسروں کو نہیں دیکھا مگر اسے یقین تھا کہ اُسی کی طرح دوسروں کے دل بھی اُن کی کنپٹیوں میں دھڑک رہے ہوں گے۔ٹابوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی اور اندھیرے میں وہ سب گردنیں اُٹھائے آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ایک پُر خوف تجسس کے ساتھ۔"(8)

اسطورہ بطور استعارہ دراصل انسانی خوف کی وہ قدیم صورت ہے جو وقت کے ساتھ علامت میں ڈھل گئی ہے۔انسان جب قدرت، موت، تنہائی، یا نامعلوم طاقتوں کے سامنے بے بس محسوس کرتا ہے تو وہ اپنے خوف کو کسی کہانی، دیوتا، عفریت یا مافوق الفطرت کردار کی شکل دے دیتا ہے۔بقول پروفیسر ناز قادری

"بہ ظاہر یہ کہانیاں فوق الفطرت صورت حال پیش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کی تہہ میں معانی کا ایک جہان چھپا ہوتا ہے۔صرف مافوق الفطری کہہ کر انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ خرافات کا نام دے کر انہیں بے مصرف قرار دیا جا سکتا ہے۔"(9)

ان کہانیوں کی اصل قدر ان کے مافوق الفطرت ہونے میں نہیں بلکہ ان کے اندر پوشیدہ علامتی مفہوم میں ہے۔یہ قصے حقیقت سے فرار نہیں بلکہ حقیقت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔بظاہر غیر حقیقی نظر آنے والی صورتِ حال دراصل انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کی ترجمان ہوتی ہے جنہیں براہِ راست کہنا مشکل ہوتا ہے۔خوف، تنہائی، جبر، بے بسی اور اندرونی کشمکش جیسے احساسات ان کہانیوں میں علامتوں کے پردے میں سامنے آتے ہیں۔اس طرح یہ فضا محض تجسس یا

حیرت پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ حقیقت ہمیشہ وہی نہیں ہوتی جو ظاہری آنکھ کو دکھائی دے بلکہ اس کے پیچھے ایک گہرا معنوی نظام بھی کارفرما ہوتا ہے۔اسی کی ایک مثال رزاق بن سلام کے افسانہ "ایک جھوٹی/سچی کہانی" سے دیکھئے:

> "دھوکہ فریب، لوٹ، مار، قتل وغارت گری روز کا معمول بن گیا۔۔۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم تھا، بوڑھے گھر کی چار دیواری میں بیٹھے گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے رہے اور جوان تلواریں اور نیزے لیے ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے رہتے۔ کوئی تلوار سے کسی کا سر قلم کر دیتا، کوئی نیزے سے کسی کا سینہ چھید دیتا۔ معصوم انسانوں کے لیے روز بروز زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔"(10)

درج بالا اقتباس جبر کی اُس بھیانک صورت کو نمایاں کرتا ہے جس میں پورا سماج خوف، تشدد اور بے یقینی کے شکنجے میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دھوکہ، لوٹ مار اور قتل وغارت محض انفرادی جرائم نہیں بلکہ ایک ایسے ظالمانہ نظام کی علامت ہیں جس نے انسانی زندگی کی حرمت کو پامال کر دیا ہے۔ بوڑھوں کا گھروں میں بیٹھ کر گڑگڑانا اس بے بسی کی تصویر ہے جو جبر کے سامنے خاموش دعا میں بدل جاتی ہے جبکہ نوجوانوں کا ہتھیار اٹھا کر گھومنا اس ماحول کی نشانی ہے جہاں طاقت ہی قانون بن جاتی ہے۔اس فضا میں انسان، خاص طور پر معصوم اور کمزور طبقہ، مسلسل عدمِ تحفظ کا شکار ہے اور اس کی زندگی دن بہ دن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یوں یہ منظر جبر کے اُس اجتماعی تجربے کو سامنے لاتا ہے جہاں خوف، تشدد اور ناانصافی ایک معمول بن جاتے ہیں اور انسان اپنی ہی سرزمین پر اجنبی اور غیر محفوظ محسوس کرنے لگتا ہے۔افسانہ "دودِچراغ" میں جبر اور خوف کی مثال دیکھئے:

> "اس سے پہلے کہ وہ معاملے کو سمجھ سکتا۔ انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ کسی نے اپنے ہاتھ کی چمکتی گپتی اس کے سینے میں گھسیڑ دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک سنسناتا ہوا تلوار کا وار اس کے دائیں کاندھے پر پڑا تھا اور وہ زمین پر لڑھک گیا۔ وہ چیخ بھی نہیں سکا نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکا۔ اس کے منھ سے ایک دردناک کراہ نکل گئی تھی بس۔ پھر اسکے چاروں طرف اندھیرے کی تہیں گہری ہوتی چلی گئیں۔"(11)

یہ منظر خوف اور جبر کے اُس انتہائی لمحے کی تصویر پیش کرتا ہے جہاں انسان کو نہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے، نہ بچنے کا اور نہ ہی آواز اٹھانے کا۔ اچانک گھیر لیا جانا اس بات کی علامت ہے کہ جبر کس طرح فرد کو بے خبر اور بے بس حالت میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ جسم پر ہونے والے وار صرف جسمانی تشدد نہیں بلکہ اس سماج کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں طاقت ہی فیصلہ کن بن چکی ہے اور انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ چیخ نہ نکل پانا اور مدد نہ مانگ سکنا اس خوف کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے جس میں انسان کی آواز بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہے۔ آخر کار اندھیرے میں ڈوب جانا محض موت کا استعارہ نہیں بلکہ اس اجتماعی خاموشی کی علامت ہے جو جبر کے ماحول میں چھا جاتی ہے جہاں ظلم ایک معمول بن جاتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ اپنے وجود سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی خاموش جبر سماج کے اُن رسم و رواج میں بھی جھلکتا ہے جو مذہب اور روایت کے نام پر انسانیت کو روند دیتے ہیں۔ جب کسی لڑکی کا شوہر مر جاتا ہے اور بعض معاشرتی عقائد کے تحت اسے بھی اسی آگ میں

جھونک دیا جاتا ہے تو یہ محض ایک رسم نہیں بلکہ عورت پر مسلط اُس ظالمانہ نظام کی علامت بن جاتا ہے جو اسے جینے کا حق بھی نہیں دیتا۔ افسانہ "ستی" میں یہی روایت اس اجتماعی ظلم کی نمائندگی کرتی ہے، جہاں خوف، بے بسی اور خاموشی مل کر جبر کی ایک ہولناک تصویر قائم کرتے ہیں۔

"آہستہ آہستہ شعلے بلند ہونے لگے اور اس نے اپنے بدن پر آنچ کی حرارت محسوس کی۔۔۔اچانک ایک چیخ جو جانے کتنی صدیوں سے اس کے سینے میں قید تھی کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر حلق سے نکلی۔ نہیں ـــــ میں مرنا نہیں چاہتی ـــــ میں اس لاش کے ساتھ بھسم ہونا نہیں چاہتی ـــــ مجھے زندہ رہنا ہے ـــــ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔۔۔مجھے مت جلاؤ ـــــ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ـــــ میں مرنا نہیں چاہتی ـــــ میں مرنا نہیں چاہتی ـــــ مجھے مت جلاؤ ـــــ مجھے مت جلاؤ۔"(12)

یہ افسانہ عورت پر مسلط اُس جبر کی انتہائی اور دل ہلا دینے والی صورت کو سامنے لاتا ہے جہاں اس کی مرضی، اس کی زندگی اور اس کا وجود سب کچھ ایک ظالمانہ رسم کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ یہ رسم صدیوں سے قائم اس روایت کی بے رحمی کو بھی عیاں کرتی ہے۔ یہ نسوانی کردار اُن بے شمار عورتوں کی آواز بن جاتا ہے جو نسل در نسل خاموشی کے اندھیرے میں دفن کر دی جاتی رہیں۔ اور اسی جبر سے انہیں خاموش کروایا جاتا رہا۔ یوں یہ منظر رسم کے پردے میں چھپے ہوئے ظلم، سماجی بے حسی اور عورت کی بے بسی کا ایسا استعارہ بن جاتا ہے جو قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔

سماجی رسومات یا دیگر مذاہب کی تہذیب کے بارے میں دی کونسائس آکسفورڈ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز، میں کرس بیلڈک کہتے ہیں کہ

> "A kind of story or rudimentary narrative sequence, normally traditional and anonymous, through which a given culture ratifies its social customs or accounts for the origins of human and natural phenomenon, usually in supernatural or boldly imaginative terms."(13)

ترجمہ:

ایک قسم کی کہانی یا جس میں بنیادی طور پر بیانیہ کا ایک تسلسل ہو جس کے تحت کوئی تہذیب اپنے سماجی رسومات یا بنی نوع انسان اور فطرت کے مظہرات کے منابع کی توثیق کرتی ہے۔ بالعموم اس قسم کی کہانی مافوق الفطری یا انتہائی تخیلاتی نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔

اساطیر میں کسی بھی افسانے یا ناول کی کہانی محض دیومالائی، تفریح یا واقعہ بیان کرنے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کا بنیادی مقصد ایک تسلسل کے ذریعے کسی معاشرہ یا تہذیب کی شناخت اور روایت کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ ایسی کہانی میں دکھایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے سماجی رسومات، اقدار اور رویّوں کو کیسے برقرار رکھتے ہیں اور فطرت یا انسانی تجربات کو کس طرح اپنی زندگی اور اقدار کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں یہ کہانی ایک علامتی یا بیانیہ فریم میں انسانی زندگی، معاشرت اور قدرت کے

مظاہروں کو جوڑ کر ایک مربوط تصویر پیش کرتی ہے جس سے قاری کو نہ صرف قصہ سمجھ میں آتا ہے بلکہ اس معاشرتی اور ثقافتی پس منظر کا شعور بھی ملتا ہے۔ شکیل الرحمٰن اس حوالے سے قلم طراز ہیں:

> "اساطیر اور اساطیری قصوں کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سچائی بھی سامنے آجاتی ہے کہ تمام اسطوری قصے صرف دیوی دیوتاؤں سے تعلق نہیں رکھتے۔"(14)

اسی طرح اساطیر اور اساطیری کہانیوں کا مطالعہ یہ حقیقت بھی واضح کر دیتا ہے کہ تمام اساطیری قصے صرف تخیلاتی یا مافوق پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ یہ انسانی زندگی کے سماجی، اخلاقی اور جذباتی پہلوؤں کی علامتی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یوں رسم یا روایت میں چھپے ظلم اور اساطیری قصوں کے اندر پوشیدہ معانی ایک ہی پیغام کو مختلف انداز میں قاری کے سامنے رکھتے ہیں جہاں خوف، جبر اور انسانی تجربات علامتی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی جبر اور قانون شکنی کی مثال افسانہ "انجام کار" میں کچھ اس انداز میں تحریر ہے:

> "دیکھو ہم ابھی تمہارے ساتھ دو چار سپاہی روانہ کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے آدمیوں کی مشکیں کسوا کر یہاں بلا سکتے ہیں مگر سوچو اس سے کیا ہوگا۔ وہ دوسرے ہی دن ضمانت پر چھوٹ جائے گا اور پھر تمہیں وہیں رہنا ہے اور وہ ہے غنڈا آدمی چھوٹنے کے بعد وہ انتقاماً کچھ بھی کر سکتا ہے مگر سر قانون۔"(15)

مصنف نے اپنی تخلیقات میں جہاں خوف، اندھیرے، کشمکش کو اپنے بنیادی کرداروں کے ذریعے بیان کیا وہیں انہوں نے اپنے افسانہ "انجام کار" میں بھی اِسی خوف کو بیان کیا ہے جو کہ سماجی استعارے کے طور پر اُبھرتا ہے۔ سماج میں موجود قانون معاشرے میں رہنے والے مظلوم لوگوں کو انصاف مہیا کرتا ہے لیکن بعض اوقات طاقت ور اتنا طاقت میں ہوتا ہے کہ وہ جبر کی انتہا ختم کر دیتا ہے۔ درج بالا اقتباس میں بھی واضح انداز میں مصنف نے کرداروں سے ایسے الفاظ کہلوائے ہیں جو کہ سماج کی حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس میں کسی قسم کی دو راہے نہیں ہے۔ مصنف نے معاشرے کی حقیقت کو آئینہ دِکھایا ہے بنا کسی بھید بھاؤ کے۔ اُن کے سبھی افسانوں میں یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کرتے بلکہ صاف ستھرے الفاظ میں سماج کی تلخی کو بیان کر دیتے ہیں گو کہ استعاراتی انداز اپناتے ہیں لیکن کرداروں کو ایسے مکالمے دیتے ہیں جو کہ سچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس بارے میں جمال عباس فہمی لکھتے ہیں:

> "وہ (سلام بن رزاق) معاشرے کے گھناؤنے چہرے سے بہت اچھی طرح آشنا ہے اور جو نہایت دیانت داری سے معاشرے کی سچائی کو بیان کر دیتا ہے۔ اس کا لہجہ بے باک ہے لیکن اس میں ہلکا پن نہیں ہے۔ بات کو پر پیچ طریقے سے نہیں بلکہ سادہ اور شستہ انداز میں کہنے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ دکھ درد کے ماروں کی یاس اور محرومی کا ترجمان ہے۔ معاشرے کے دبے کچلے لوگوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"(16)

ضروری نہیں ہوتا کہ اساطیری کہانیاں انسان کو صرف تخیل میں لے جائیں اور انسان اُسی رنگین زندگی میں رہنا شروع کر دے بلکہ جس طرح لیوی سٹراس نے اساطیر یا اسطور کے معانی بدلے ہیں بالکل وہی بدلے ہوئے معانی اور حقیقت سلام بن رزاق کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ مصنف نے بھی سماجی پہلوؤں کو بطور استعارہ پیش کر کے حقیقت سے روشناس کروانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ حاکم، محکوم، اچھائی برائی، خوف، جبر وغیرہ یہ سماج سے ہی منسوب ہیں اس لیے انہوں نے انہی سماجی استعاروں کی اپنے افسانوں میں نشاندہی کی ہے۔

سلام بن رزاق نے جہاں اپنے افسانوں میں خوف کی صورت حال کو بیان کیا ہے وہیں پر انہوں نے قربانی کی مثال کو بھی پیش کیا ہے گو کہ یہ استعارہ اُن کے بہت کم افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن وہ سماج کے اِس پہلو کو رد نہیں کرتے بلکہ معاشرے کو اِس چیز سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ قربانی کی اِس مثال کو وہ اپنے افسانہ "آدمی اور آدمی" میں یوں پیش کرتے ہیں:

> "لوگوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان بجلی کی تیزی کے ساتھ پلیٹ فارم سے پٹری پر گودا اور بچے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹے ہوئے پٹری کی دوسری طرف لڑھک گیا۔۔۔ نوجوان کو کودتے دیکھ کر لوگوں نے بے اختیار چیخنا شروع کر دیا۔۔۔ ٹرین چند میٹر آگے پلیٹ فارم پر رک گئی اور لوگ پٹری پر کود کر نوجوان کے قریب پہنچے۔ بچہ بالکل صحیح سلامت تھا مگر نوجوان کے بائیں پاؤں کی تین انگلیاں ٹرین کے پہیوں کے نیچے کچل گئی تھیں۔ اور وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ لوگوں نے نوجوان کو سہارا دے کر اٹھایا۔"(17)

اس افسانہ میں مصنف نے ایک نوجوان لڑکے کی قربانی کو بطور استعارہ پیش کیا ہے۔ وہ لڑکا اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ایک بچے کی جان بچاتا ہے حالانکہ وہ خود کرب میں ہوتا ہے لیکن اُسے اِس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یوں افسانہ "آدمی اور آدمی" میں یہ بنیادی کردار ایک ایسے استعارے میں ڈھل جاتا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کا اصل مقام اس کی تکلیف میں نہیں بلکہ اس کے عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے جہاں وہ دوسروں کی زندگی کے لیے اپنی ذات کو وقف کر کے قربانی کی مثال قائم کرتا ہے۔ وہیں یہ عمل محض ایک وقتی حادثہ نہیں رہتا بلکہ ایک علامتی اور معنوی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ واقعہ اساطیری سطح پر بلند ہو جاتا ہے کیونکہ اساطیر بھی انسان کو صرف کہانیاں سنا کر محظوظ نہیں کرتیں بلکہ اسے زندگی، تہذیب اور وجود کے بنیادی سوالات سے روشناس کراتی ہیں۔ جس طرح اس نوجوان کی قربانی ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ انسان کی اصل پہچان ایثار اور اخلاقی ذمہ داری میں ہے اسی طرح اساطیری بیانیہ بھی فرد کو یہ سکھاتا ہے کہ زندگی محض ذاتی بقا کا نام نہیں بلکہ اجتماعی فلاح، اخلاقی شعور اور تہذیبی اقدار کی پاسداری کا تقاضا کرتی ہے۔ یوں یہ کردار ایک جدید اساطیری پیکر بن جاتا ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ فن اور اسطورہ محض فنکارانہ تفریح نہیں بلکہ انسان کے وجودی، اخلاقی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہیں۔

> "اساطیر انسانی سوچ، کائنات، زندگی اور تہذیب کے بنیادی سوالات کے بارے میں انسان کو معنوی اور فکری انداز میں سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس مطالعے کے مطابق اساطیری قصے

انسانی ذہن کو صرف فنکارانہ تفریح نہیں دیتے بلکہ وجودی، اخلاقی، سماجی اور ثقافتی معنویت فراہم کرتے ہیں۔"(18)

سلام بن رزاق کے افسانوں میں اسطور کسی دیومالائی قصے یا مافوق الفطرت کہانی کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوتا بلکہ وہ سماجی حقیقت کی تہوں میں رچی بسی ایک علامتی اور فکری ساخت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے یہاں اساطیر کا مطلب پرانے دیوتاؤں، عجیب و غریب مخلوقات یا غیر حقیقی دنیا نہیں بلکہ وہ بنیادی تضادات ہیں جو ہر انسانی سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیوی سٹراس کے اساطیری تصور کے مطابق اسطور دراصل زندگی اور موت، اچھائی اور برائی، حق اور باطل، روشنی اور تاریکی جیسے متضاد تصورات کو ایک بامعنی رشتے میں جوڑنے کا نام ہے اور سلام بن رزاق کے افسانے انہی داخلی کشمکش کو سماجی استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار ایسے حالات میں جیتے ہیں جہاں یہ تضادات روزمرہ زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی طاقت اور بے بسی کی کشمکش میں، کبھی مذہب اور انسانیت کے ٹکراؤ میں اور کبھی روایت اور جدیدیت کے تصادم میں۔ اس طرح ان کے ہاں اسطور کوئی قدیم داستان نہیں بلکہ ایک زندہ سماجی شعور ہے جو قاری کو یہ باور کراتا ہے کہ انسانی معاشرہ انہی بنیادی تضادات کے درمیان تشکیل پاتا ہے اور انہی سے اس کی فکری، اخلاقی اور تہذیبی شناخت وجود میں آتی ہے۔

حوالہ جات:

1. C. G. Jung, The Archetypes and the Collective Unconscious, volume 9, part 1, Princeton University Press, 1977, p. 42.
2. Mircea Eliade, Myth and Reality, Harper & Row, 1963, p. 15.
3. Joseph Campbell, The Power of Myth, Doubleday, 1988, p. 22.
4. عتیق اللہ، پروفیسر، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اردو مجلس، دہلی، 1996ء، ص 127
5. سلام بن رزاق، شکستہ بتوں کے درمیان، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی، 2010ء، ص 5
6. ایضاً، ص 12،13
7. ایضاً، ص 23
8. ایضاً، ص 27
9. ناز قادری، پروفیسر، اردو ہندی فکشن میں اساطیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2021ء، ص 23
10. سلام بن رزاق، زندگی افسانہ نہیں، کلاسک آرٹ پرنٹرز، دہلی، 2012ء، ص 12،13
11. سلام بن رزاق، معبر، کہانی پبلی کیشنز، بمبئی، 1987ء، ص 15
12. ایضاً، ص 40،41
13. The Concise Oxford Dictionary of Literary Terms, Oxford University, Press, New York, 2004, p. 76.
14. شکیل الرحمٰن، اساطیر کی جمالیات، عرفی پبلی کیشنز، ہریانہ، 2009ء، ص 12
15. سلام بن رزاق، شکستہ بتوں کے درمیان، ایضاً، ص 40
16. جمال عباس فہمی، اپنے حصے کا زہر پینے والا قلمکار، سلام بن رزاق، قومی آواز، 10 اپریل 2023ء
17. سلام بن رزاق، زندگی افسانہ نہیں، ایضاً، ص 93،94
18. احمد عبداللہ قمر، ڈاکٹر، تہذیب کا اساطیری تناظر، جرنل آف ریسرچ، اردو، شمارہ 40، جلد 1، 2024ء، ص 65

کتابیات:

احمد عبداللہ قمر، ڈاکٹر، تہذیب کا اساطیری تناظر، جرنل آف ریسرچ، اردو، شمارہ 40، جلد 1، 2024ء

جمال عباس فہمی، اپنے حصے کا زہر پینے والا قلمکار، سلام بن رزاق، قومی آواز، 10 اپریل 2023ء

سلام بن رزاق، شکستہ بتوں کے درمیان، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی، 2010ء

سلام بن رزاق، معبر، کہانی پبلی کیشنز، بمبئی، 1987ء

سلام بن رزاق، زندگی افسانہ نہیں، کلاسک آرٹ پرنٹرز، دہلی، 2012ء

شکیل الرحمٰن، اساطیر کی جمالیات، عرفی پبلی کیشنز، ہریانہ، 2009ء

عتیق اللہ، پروفیسر، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اردو مجلس، دہلی، 1996ء

ناز قادری، پروفیسر، اردو ہندی فکشن میں اساطیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2021ء

C. G. Jung, The Archetypes and the Collective Unconscious, volume 9, part 1, Princeton University Press, 1977.

Joseph Campbell, The Power of Myth, Doubleday, 1988.

Mircea Eliade, Myth and Reality, Harper & Row, 1963.

The Concise Oxford Dictionary of Literary Terms, Oxford University, Press, New York, 2004.